ڈاکٹر سید عبداللہ

ہمارے تعلیمی مسائل

پاکستان ہی اس وقت ایک ایسا ملک ہے جس نے ایک نئے ثقافتی اور اجتماعی عقیدے کو اپنا نصب العین بنا کر ایک نئی مملکت کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ نصب العین محض جذباتی سا نظریہ نہیں۔ بلکہ ایک ایسا تصوّر ہے جس میں غایتوں کے لحاظ سے بڑے ثقافتی اور اجتماعی امکانات موجود ہیں۔ اور اگر اس نظریئے پر عمل کیا جائے تو یہ کوششیں ضرور بار آور ہونگی۔ اور اس سے عالمِ انسانی کو بڑے بڑے اجتماعی فوائد حاصل ہونگے۔ پاکستان ایک منفرد قسم کا سیاسی و عمرانی تجربہ ہے اور اس کے تعلیمی منصوبے پر بھی ایک منفرد تجربے کی حیثیت سے غور کرنا چاہئے تاکہ یہ تعلیم پاکستان کے مخصوص عقائد کے عین مطابق ہوسکے۔

مروجہ تعلیم کے نقائص اس قسم کا تعلیمی منصوبہ بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے مروجہ تعلیمی نظام کے نقائص کا پورا پورا اعتراف کر لیا جائے۔ یہ تو ماننا پڑے گا کہ گذشتہ ایک سو سال میں اس برصغیر میں تعلیم ایک خاص غرض کے تحت چلتی رہی۔ اس عرصے میں بظاہر تعلیم کے بعض شعبوں میں ترقی بھی ہوئی۔ مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا بڑا وسیع نظام قائم ہوا۔ تعلیم و تربیت کے بعض جدید ترین طریقوں اور اصولوں سے کام لیا گیا۔ نظم و ضبط کا احساس ہوا۔ اور اصول و قواعد وضع ہو کر رائج ہوئے اور مختلف اشغال کے مدِّ نظر تعلیم کے مختلف میدان تجویز ہوئے اور ان میں ضروری ترقیات ہوتی رہیں۔ غرض گذشتہ سو سال میں مروجہ تعلیم، کئی اعتبار سے ملک کے لئے مفید بھی ثابت ہوئی، اور اس کے عملی اور تجرباتی نتائج کا ایک حصّہ ایسا بھی ہے جس کے تحفّظ کی اب بھی ضرورت ہے کیونکہ اس کو ہم اپنی تعلیم کا قیمتی ورثہ خیال کرتے ہیں۔

بادیں ہمہ پاکستان کے موجودہ عقائد کے پیشِ نظر ہم اس تعلیمی نظام کو قومی تعلیم کا درجہ نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اس تعلیم کا بنیادی محرک جذبہ غرض مندانہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کے اصول بیشتر صورتوں میں غیر قدرتی اور غیر عقلی تھے۔ اس میں ہمارے ملک کی سماجی، اخلاقی اور تہذیبی ضرورتوں کو مدِّ نظر نہیں رکھا گیا تھا اور اس کے اکثر نمونے یا خاکے مستعار اور اجنبی تھے۔ ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری یہ تعلیم ہمارے حق میں اتنی مفید ثابت نہیں ہوئی، جتنا کسی اچھی تعلیم کو ہونا چاہئے۔

ایک بہت بڑا نقصان اس نظامِ تعلیم سے یہ ہوا کہ ہماری تعلیمی روایت کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ کیونکہ یہ تو مسلّم ہے کہ اس ملک میں بھی ایک تہذیب، ایک ثقافت تھی۔ اس ملک کے لوگوں کا بھی کوئی ادب تھا۔ ان کی بھی کوئی روایات

تھیں۔ ان کا بھی کوئی نظام تعلیم و تربیت تھا۔ میکالے کی نظر میں ان کی اہمیت کچھ بھی ہو یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ تاج محل کی بنا ڈالنے والی قوم دل اور نظر کی کچی نہیں ہو سکتی۔ پاک بین نگاہ اور گداز دل کی یہ تہذیب کسی گھنیر تعلیمی روایت کے بغیر ممکن نہیں۔ مگر غیر ملکی حکومت نے یہ تعلیمی روایت یکسر فنا کر دی۔ اس میں اس کے بُرے ارادے کا دخل نہ بھی ہو، تب بھی اس سے ہمارے فکر و نظر کی قدرتی ترقی بالکل رک گئی۔ اس سے ہماری تعلیم دو متحارب کیمپوں میں تقسیم ہو گئی اور ملک ان عمدہ نتائج علمی سے محروم ہو گیا جو ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے اجتماع و ترکیب سے لازمی طور سے برآمد ہوتے۔ آج کئی سوچنے والے اور محسوس کرنے والے یہ شکایت کرتے ہیں کہ اب ہم میں غزالی، ابنِ خلدون اور شاہ ولی اللہ نہیں پیدا ہوتے۔ دراصل اس کی ذمہ واری ہماری ڈیڑھ ہزار سالہ تعلیمی روایت کے انقطاع پر ہے جس سے بڑھتی ہوئی روایت تو ختم ہو گئی مگر علم و تعلیم تصنیف و تحقیق اور آزادانہ غور و فکر کی کوئی نئی روایت پیدا نہ ہو سکی۔

تعلیم کی غایت

بہر صورت اب پاکستان کے نظامِ تعلیم کی اساس اور غایت کو بدل دینا ہو گا۔ سب سے پہلے پاکستانی تعلیم کی غایت متعین کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اسی پر اس ملک کی ساری تعلیم کی عمارت بلند ہو سکے گی اور اسی سے اس کی تفصیلات و جزئیات کے نقوش تیار ہو سکیں گے۔ تعلیمی غایت کے سلسلے میں مخصوص عقائد کا سوال اس لئے اٹھایا گیا ہے کہ تعلیم کے عام اور مثالی نصب العین کچھ بھی ہوں عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم کے نظامِ تعلیم پر اس کے مخصوص سیاسی اور تہذیبی احوال کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ اور عملی شکل میں اقوامِ عالم میں سے ہر قوم اپنے خاص احوال کو مدنظر رکھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ نظری اعتبار سے تو تعلیم کا ہر نصب العین اور ہر مقصد نیک ہی ہوتا ہے۔ مثلاً شخصیت کی تکمیل، خیر، صداقت اور حسن کی قدروں کی تربیت، عملی قابلیتوں کی تکمیل وغیرہ وغیرہ۔ افلاطون سے لے کر آج تک کئی اہلِ فکر نے تعلیم کے لئے نہایت اونچے اور مثالی مقاصد تجویز کئے ہیں۔ مگر اس کو تعلیم کی بدقسمتی کہئے یا ناگزیر خصوصیت کہ تہذیبِ انسانی کے ہر دور میں وہ سامنے کے مخصوص عمرانی یا سیاسی فلسفوں سے ضرور اثر پذیر ہوتی رہی ہے۔ جن میں سے بعض نے حقیقی تعلیم کو آگے بڑھایا اور بعض نے اس کو پیچھے ڈھکیل دیا۔ مگر مخصوص ملکی اور سماجی احوال کا اثر ہر دور میں ہوتا رہا اور اس کو قبول کرنے پر ہر قوم مجبور رہی۔

بظاہر یہ تصوّر تنگ نظری پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور پاکستان کو اس تنگ نظرانہ اور محدود نقطۂ نظر کی دعوت کبھی نہ دی جاتی۔ اگر یہ معلوم نہ ہوتا کہ خوش قسمتی سے پاکستان کی بنیادی تعلیمی غایت قومی ہو جانے پر بھی وسیع اور آفاق گیر ہی رہے گی۔ یورپ اور امریکہ کے ماہرینِ تعلیم صدیوں کے تجربوں، کاوشوں اور بحثوں کے بعد جس بین الاقوامیت کی طرف اب رجوع کر رہے ہیں وہ بین الاقوامیت، آفاقیت اور انسانیت سے مانوس ہے۔ یورپ اور امریکہ بڑی بڑی فکری بغاتوں کے بعد آج اس تصوّر کے قریب آئے ہیں جو نسل اور جغرافیہ کی حدوں سے بلند تر نظر کا مدعی ہے۔ اسلام کا یہ عقیدہ اس کے اوّلین عقائد میں سے ہے۔

یورپ میں دوسرے شعبہ ہائے فکر و نظر کی طرح تعلیمی نظریات میں بھی بغاوتوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے۔ کلاسیکی روایت کے خلاف انسانیاتی تحریک (Humanism) کی بغاوت، اس کے خلاف عمرانیاتی پھر عام سائنسی تحریک۔ بیچ میں شوپن ہار کی خود رو رضائیت (Voluntarism) اور پھر عملی تجرباتی تحریک (Pragmatism) غرض اسی طرح تعلیم کبھی قومی، کبھی نسلی، کبھی علاقائی عصبیتوں سے متاثر ہوتی رہی، جس کا ایک نمایاں نقطہ وہ تھا جو نازی جرمنی کی درس گاہوں میں نمودار ہوا اور ایک وہ ہے جو اس وقت ایک طرف روس کی منظم تدریس میں ملتا ہے اور دوسری طرف امریکہ کی "قومی بین الاقوامیت" کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

ان سب نظریات میں اصولی اختلافی مسئلے کم و بیش دو ہی ہیں اوّل یہ کہ تعلیم کا مقصود کس قسم کے انسان اور کس قسم کی سوسائٹی پیدا کرنا ہے اور دوسرا یہ کہ خدا اور انسان اور فرد و جماعت کے باہمی روابط کیا ہیں اور تعلیم ان کی تنظیم میں کیا مدد دے سکتی ہے؟

تعلیمی افکار کا رجحان

دنیا کے موجودہ تعلیمی افکار کے تجزیے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت ذہن انسانی، انسان کی ان قسموں کے جھگڑے سے سخت تنگ آ گیا ہے اور اب وہ ایک ایسے انسان کی تلاش میں ہے جو عالم ہو یا نہ ہو نیک ضرور ہو۔ اور اسے اب ایک ایسے معاشرہ کی تلاش ہے جس کی حدیں جغرافیہ نے نہیں، انسانیت نے قائم کی ہوں۔ اسی طرح انسان اب مادے کی کارفرمائیوں سے خوف زدہ ہو کر خود اپنے مستقبل کے بارے میں مشوش ہے۔ ان حالات میں اب دنیا روحانیات اور مادیات میں مناسب پیوند اور خوشگوار توازن کی آرزومند ہے۔ وہ خاص کی بجائے عام، قومیت کی بجائے بین الاقوامیت اور عصبیت کی بجائے انسانیت کی طرف مائل ہے۔ اور تعلیم کو سائنس بنانے کی بجائے پھر اخلاق، دین اور فلسفہ بنانے کے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں اس کی تائید امریکہ کی مجلس مذاکرۂ تعلیمی کی روداد کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے ہوتی ہے:

"If education in the United States at this critical stage in civilized history is to set an example, is to be of service to human nature in its variety and richness, education should cease to serve the material at the expense of spiritual, the special at the expense of the general. It should cease to serve the interests of the nation at the expense of world community, upon the creation of which the welfare of every nation, our own not least, has come to depend."

اسی طرح صدر امریکہ کے تعلیمی کمیشن کی اکثر سفارشات کا رُخ بھی ادھر ہی ہے۔ یہاں تک کہ خود روس میں بھی جس پر جبریت کا غلبہ ہے (Return to Culture) کی صدا سننے میں آ رہی ہے۔ جو دراصل مادی افادیت کے ڈھیلا ہونے کی

واضح علامت ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تعلیم کا عام رجحان یہ ہے کہ اس میں مادی مقاصد کے ساتھ ساتھ روحانی و اخلاقی تکمیل بھی مدِنظر رہنی چاہئے۔ یہ تصوّر وہ ہے جو دنیا کو بڑی روحانی آزمائش اور سخت ذہنی تکلیف کے بعد اب ہاتھ آیا ہے۔ مگر یہ تصوّر تو وہی ہے جو مسلمانوں کی تعلیمی روایت کا ہمیشہ سے ایک اہم اصول رہا ہے۔

امام غزالی کی رائے میں تعلیم کا مقصد محض رضائے الٰہی کا حصول ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ رضائے الٰہی ہے کیا؟ یہ ہے انسان کے انسان و کائنات سے روابط کی ایک صورت جس میں بندے کو ہر وقت یہ مدنظر رہے کہ خدا ہی ساری دنیا کا خالق ہے۔ اسی نے سارے عالم کو کنفس واحد پیدا کیا ہے۔ ذات خداوندی کا یہی احساس تعلیم کی غایتِ اولیٰ ہے، جو اگرچہ ہے بہت دشوار مگر نسل انسانی کی آخری اُمید اسی قسم کے تخیل میں ہے۔ پاکستان کے لئے یہ نظریہ کوئی نیا نہیں۔ یہ تو اس کا اپنا نظریہ ہے۔ جو اسلام نے اس کو صدیوں پہلے دیا ہے۔ جس سے اسلامی تہذیب کی ساری بنیادی روح کم و بیش ہمیشہ سرشار رہی ہے۔

اس موقع پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ عام طور پر مسلمانوں کے گذشتہ تعلیمی نظریات اور نظامات کے متعلق یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ان کی اساس محض دینی اور راہبانہ ہے۔ اور اس کے نظام میں عقلی، تجربی اور سماجی علوم کا حصّہ معدوم یا ناقص ہے۔ مگر یہ رائے حقائق کی روشنی میں صحیح نہیں۔ تاریخی لحاظ سے عہدِ اسلامی کے تقریباً ہر دور میں مقتضیاتِ زمانہ کے مطابق نصاب کے عملی پہلوؤں کو خاص اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ مقدمہ ابنِ خلدون کے تعلیمی مباحث میں تعلیم کے عملی عناصر کا بڑا عمدہ تجزیہ مل سکتا ہے۔ ابنِ خلدون کو اپنے زمانے کے تعلیمی نصاب کے خلاف بڑی شکایت یہ تھی کہ اس میں صرف و نحو پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک اس طریقے سے قوتِ تفکّر اور تحصیلِ زبان کی آزاد کوشش کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اور یہ شکایت پرانے نصاب کے متعلق آج بھی درست ہے۔ مگر سماجی علوم اور طبیعی علوم سے پرانے زمانے کا نصاب خالی نہ تھا۔ ابنِ خلدون نے ان کا خصوصی تذکرہ کیا ہے ہندوستان کے آخری دَور میں درس نظامیہ ہی کو لے لیجئے، اس میں بھی عقلی علوم کا حصّہ خاصا ہے۔ اور درس نظامیہ کے خلاف تو بڑا اعتراض ہی یہ ہے کہ اس میں دینی عنصر کمزور اور دوسرے علوم کا حصّہ زیادہ ہے۔ چنانچہ کل نصاب میں دین کی کتابیں صرف تین ہیں۔ ایک تفسیر کی، ایک حدیث کی، ایک فقہ کی، باقی سب کتابیں عملی علوم سے متعلق ہیں جن میں سے بعض زبان و ادب کی استعداد کے لئے اور بعض تعقل و تفکر کی تربیت کے لئے رکھی گئی ہیں۔

غرض، پرانے نصاب و نظام پر لاکھ دوسرے اعتراضات ہوں مگر یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ یہ نصاب عملی اور سماجی علوم کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ پرانے تمام مشہور نصابوں کی اصل روح یہی رہی ہے کہ ان سے دینی و دنیاوی اور علمی و عملی کا لفظی امتیاز مٹ کر ایک ایسا متوازن رویہ نمودار ہو جو زندگی کو وحدت بسیط کی حیثیت سے دیکھ سکے۔ غرض

دین و دنیا کے درمیان توازن پیدا کرنا اور قائم رکھنا اس کا سب سے بڑا نصب العین رہا ہے۔

وحدتِ تعلیم کا اصول

اگر آج ہم پرانی تعلیم کو یک رخہ اور دنیا سے ذرا ہٹا ہوا دیکھتے ہیں تو اس کی ذمہ واری اس تعلیم پر نہیں قوم پر ہے یا اس دورِ غلامی پر ہے جس نے ہماری تعلیم کو دو کیمپوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یعنی جدید اور قدیم یا مشرقی اور مغربی یا دینی اور دنیوی۔ یہ چیز دراصل انگریزوں کا دیا ہوا تحفہ ہے جسے ہم آج تک سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ اگر ہماری تعلیم قدرتی ارتقا کی فضا میں آگے بڑھتی تو یہ دین اور دنیا کے دو کیمپ کبھی قائم نہ ہوتے کیونکہ ہمارے تصورات کی رُو سے دنیا دین کے اندر ہے۔ اس سے باہر نہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے یہاں Christendom کی سی اصطلاحیں نہیں ملتیں۔

یہ دوعملی غیروں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ شبلی نے ندوۃ العلماء کی تحریک میں اس دوعملی کے خلاف آواز بلند کی تھی اور "طریقۂ وحدت تعلیم" پر اصرار کیا تھا تاکہ عام تعلیم کے لئے دینی مدرسے اور دنیوی مدرسے الگ الگ قائم ہو کر قوم کو فکری انتشار میں مبتلا نہ کریں۔ مگر اس دور کے نقار خانے میں شبلی کی آواز طوطی کی آواز سے بھی نحیف تر ثابت ہوئی۔ غلامی کے خاتمے کے بعد ہماری پاکستانی تعلیم نظریۂ وحدت تعلیم کے اصول پر نافذ ہونی چاہیے جس میں ملا اور بابو کی یہ تقسیم باقی نہ رہے۔ اس طرح علوم دین بھی محفوظ رہیں گے اور دنیوی علوم بھی دین کے دائرے میں آجائیں گے۔ اور روز روز کا یہ غوغا بھی ختم ہو جائے گا کہ حکومت علوم مشرقی کو مٹانے پر تُلی ہوئی ہے۔ اور یہ شکایت بھی نہ رہے گی کہ مولوی ہمارے دین کے اجارہ دار بن کر ہمیں ترقی سے روک رہے ہیں اور اہلِ دین کی یہ واویلا بھی ختم ہو جائے گی کہ تعلیم یافتہ لوگ دین سے اس درجہ بیگانہ ہو رہے ہیں کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ خلفائے راشدین کون تھے۔ اور یثرب دنیا کے کس ملک میں واقع ہے۔ وحدت تعلیم کا تصور ہی ہماری تعلیمی اور تہذیبی مشکلات کا حل ہے۔ اس دوعملی اور دو کیمپوں کی لڑائی سے تو باہمی نفرت اور بغض و عناد۔ اور اس سے بھی زیادہ دو طرفہ بے علمی اور جہالت کی توسیع کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ وقت آگیا ہے کہ ہم گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے تلخ تجربات سے فائدہ اٹھائیں اور غیروں کی نافذ کردہ اس دوعملی کا خاتمہ کر دیں۔ وحدت تعلیم کا منصوبہ صحیح بھی ہے اور قابلِ عمل بھی۔ مگر ہاں اس کے لئے تعصب اور جمود دونوں کو خیرباد کہہ دینا پڑیگا۔

انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے نقصانات

غایت کے مسئلے کے بعد یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ پاکستان کا تعلیمی نظام پہلے کی طرح پھر غیر قدرتی نہ ہونے پائے۔ مروجہ تعلیم اس معنی میں نہایت غیر قدرتی ہے کہ اس کا ذریعہ تعلیم تقریباً ایک سو سال سے ایک غیر ملکی زبان ہے جس کی مشکلات علوم کی اشاعت کے لئے سنگِ راہ بنی ہوئی ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں ذریعہ تعلیم اپنی ہی زبان ہے مگر ہمارے ملک کو مجبوراً ایک غیر قدرتی طریقِ کار پر عامل ہونا پڑا۔ یعنی اپنی زبان کی بجائے انگریزی میں پڑھنا پڑھانا۔ بعض لوگ آج بھی اس غیر قدرتی طریق کار کے حق میں ہیں مگر بیشتر عقلی اور عملی دلائل اس کے خلاف ہیں۔ انگریزی زبان کی اس حیثیت کو برقرار رکھنے کے حق میں

صرف ایک ہی دلیل ہے اور وہ یہ کہ اس کے ذریعے ہم براہِ راست انگریزی میں لکھے ہوئے علوم تک پہنچ جاتے ہیں۔ اگر اس ایک فائدے کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی منجملہ اور مضرتوں کے اس کے اس بڑے نقصان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہی چیز علوم کی عام اشاعت کے خلاف جاتی ہے اور علوم ملکی ذہنوں کے اندر جذب نہیں ہو پاتے۔ علوم زور سے دماغوں میں ٹھونسے جاتے ہیں اور اس ٹھونسا ٹھانسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں آج تک صحیح علمی اسپرٹ پیدا نہیں ہو پائی۔ ہم اس وقت محض نقال ہیں۔ ہم تو اس طوطے کی طرح ہیں جو سوچے سمجھے بغیر چند لفظوں کو رٹتا رہتا ہے۔ یا پھر ہم پیشہ ور ترجمہ کرنے والوں کی قوم ہیں۔ اور ترجمہ بھی کیسا؟ بعد از وقت اور ادھورا۔

ایک اعتبار سے تو علوم کا ترجمہ کرنا ہی فعل عبث ہے۔ علوم ترجمہ نہیں کئے جاتے۔ جذب کئے جاتے ہیں یا ان کو عمل میں لایا جاتا ہے۔ علوم اصطلاح سازی نہیں، تجربہ ہے۔ علم یقین ہی نہیں حق الیقین ہے۔ جو اپنی ترجمانی کے لئے اپنی زبان خود پیدا کرتا ہے۔ کسی دوسرے کی زبان، اصل یا ترجمے میں، علم کا منہ چڑانے کے سوا کوئی کام نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے دنیا میں اچھے ترجمے بھی کہیں ہوئے ہوں۔ مگر ایسے ترجمے تو گونگے کے اشارے ہیں فقط۔ اور ہمارے ملک میں تو ترجمہ کرنے والے ترجمہ کرتے وقت بھی انگریزی میں ہی سوچتے ہیں، کیونکہ ان کی اپنی زبان کوئی ہے نہیں جس میں وہ سوچ سکیں۔ اور جو زبان ان کی تھی وہ ایک سو سال کی غلامی نے مٹا دی۔ انگریزی سے ترجمہ کرنے والے کے لئے عربی، فارسی کی علمی زبان میں تبحر کی ضرورت ہے۔ یہ تبحر اب کہاں ہے۔ اس کا گلا تو مدرسے پہلے ہی گھونٹ چکے ہیں۔ ہاں عالموں سے کچھ استفادہ کیا جا سکتا تھا، مگر ان کو تعلیمی دوعملی نے کچھ ایسا بے آبرو کیا ہے کہ اب انہیں خود بھی اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا۔

اس دوعملی نے قدیم و جدید کے درمیان ایسی خلیج حائل کر دی ہے کہ اب مفاہمت کے دروازے تقریباً بند ہو چکے ہیں۔ گویا ایک ہی ملک میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں۔ جنکی زبانیں بھی الگ الگ ہیں اور مزاج بھی الگ الگ۔ اس صورت میں ترجمہ کرنے والے ایک نئی اور اجنبی زبان گھڑ رہے ہیں۔ جن سے کوئی طبقہ بھی واقف نہیں۔ یہی صورت اصطلاحات کی ہے بڑا سوال تو یہ ہے کہ ہم اصطلاحات کس کے لئے گھڑ رہے ہیں۔ شاید ہاٹن ٹاٹ کے لئے یا جنات کے لئے؟ کیونکہ ہم جن کے لئے یہ اصطلاحات بنا رہے ہیں وہ تو بدستور انگریزی پڑھ رہے ہیں۔ پھر ان اصطلاحات کو استعمال کون کرے گا؟ یہ نئی اصطلاحات اسی طرح بے کار رہیں گی۔ جس طرح قدیم اصطلاحات جو مولویوں کے پاس ہیں۔ اور ان سے صرف وہی باخبر ہیں دوسرا کوئی نہیں۔ غرض ایک گڑبڑ ہے جو جاری ہے اور کوئی نہیں جو مرض کے اصل علاج کی طرف متوجہ ہو۔

آخر یہ تو سوچئے کہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں ہمارے یہاں علوم کی نظری یا علمی یا تجرباتی کوئی روایت کیوں پیدا نہیں ہو سکی۔ اس کا کوئی سبب بھی تو ہو گا؟ علوم کو تجربے میں لا کر یا علمی تجربوں سے علوم کو وجود میں لا کر دنیا کے علم میں کوئی خاص اضافہ ہمارے ملک کے سائنسی عالموں نے نہیں کیا۔ اس کی بھی تو کوئی جہت ہو گی۔ علم کے جغرافیے میں ہماری بستی کا دام کہیں موجود نہیں۔ اس پر بھی تو کچھ غور ہونا چاہئے۔ ان سے بہتر تو وہی لوگ رہے جو پچھلی تربیت سے آشنا تھے۔

پھر نئی روشنی سے مستفید ہو کر اچھا خاصہ کام کر گئے۔ ان میں چند نام اقبال، امیر علی، سید علی بلگرامی، وغیرہ کے مل تو جاتے ہیں۔ جن کا امتیازی کام عالمی پیمانے پر بھی نظر انداز نہیں ہو سکتا۔ مگر خالص انگریزی تعلیم نے کیا کر دکھایا۔ اس نے کون کون بڑی ہستیاں پیدا کیں؟

اس بات سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس غیر قدرتی نظام تعلیم نے ملک کی اعلیٰ اختراعی تخلیقی صلاحیتوں کو بالکل فنا کر دیا ہے۔ ہم میں آزادانہ سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ ہماری سوچ کی دنیا تنگ ہو گئی ہے۔ ہم غلامانہ تفکر کے دائرے میں قید ہو کر اس تنگی کو بھی وسعت ہی خیال کرنے لگے ہیں۔ اور نہیں سوچتے کہ جاپان، روس، چین، بھی تو انگریزی کے بغیر جی رہے ہیں اور نظری اور تجرباتی علوم میں روز بروز آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور روس کا غیر انگریزی دان سائنس دان تو اب سوئے افلاک پہنچنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ یہ سب ترقی ان ملکوں نے اس لئے کی کہ انہوں نے اپنی تعلیم و تربیت کی اساس قدرتی اصولوں پر رکھی۔ اور ہم ڈیڑھ سو سال میں یہاں تک پہنچے کہ تجرباتی علم میں ایک مستری کی سطح تک بھی نہیں پہنچ سکے۔ آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔ اس پر کبھی تو غور کر ہی لینا چاہئے۔

تعلیم کی مدت

مروجہ نظام تعلیم کے چند اور پہلو بھی قابل غور ہیں ـــــ مثلاً تعلیم کی مدت اور اخراجات تعلیم کا سوال۔ یہ درست ہے۔ کہ ہمارا تعلیمی دائرہ اتنا وسیع ہو چکا ہے۔ اور انسانی مسائل و معلومات کی پیچ در پیچ وسعتوں کے ساتھ تعلیم کی تنظیم بھی اتنی پیچیدہ سی شے ہو گئی ہے کہ اب اس کو کامل طور پر قدیم نظام تعلیم نے نمونے پر لانا مشکل بھی ہے اور ناقابل عمل بھی۔ مگر قدیم نظام تعلیم کا ایک اصول اور تجربہ ایسا ہے۔ جو آج بھی قابل غور اور قابل قدر ہے۔ وہ ہے مدت تعلیم کا تجربہ۔ عام احساس یہی ہے کہ اس وقت طلباء کی عمر کا کارآمد اور پرجوش زمانہ غیر ضروری طور پر تعلیم میں صرف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تکمیل کے لئے ۲۰ سے لے کر ۲۵ سال تک کی عمر درکار ہوتی ہے۔ اس طرح تکمیل کے بعد تخلیق و تحقیق اور تعلیم کے عملی استعمال کے لئے جوش عملی کا زمانہ کچھ زیادہ نہیں رہتا ـــــ بقول اکبر؎

مغربی کورس میں ہوتی ہے جوانی رخصت
اب تو پیری رہی رندانہ مشاغل کے لئے

شاید یہی سبب ہے کہ ہمارے ملک میں اعلیٰ ذہنی فکری اور علمی کارکردگی کی شخصی روداد اکثر تشنہ و مختصر ہی رہتی ہے۔ اور مقابلتاً جب اسلاف کے کام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے۔ کہ اس زمانہ کے لوگوں کی زندگیاں کتنی نتیجہ خیز اور بار آور ہوتی تھیں۔ چنانچہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں کثیر التصانیف مصنفوں کی بڑی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ ان میں سے اکثر تصانیف معمولی رسائل تک محدود نہ تھیں بلکہ نہایت جامع، خیال انگیز اور عہد آفریں ہوتی تھیں۔ یہ فہرست بڑی طویل ہے۔ مگر چند[1] بزرگوں کے نام یہ ہیں۔ امام غزالی، ابن عربی، ابن الجوزی، الکندی،

---

[1] جمیل بک کی کتاب عقود الجواہر میں ۳۵ ایسے مصنفوں کے نام درج ہیں۔ جن کی تصانیف کی تعداد ۵۰ اور ۱۰۰ کے درمیان تھے۔

فخر رازی، ابن تیمیہ، سیوطی، ابن خطیب، ابن سینا، ابوبکر رازی، ابن الہیثم، زمخشری، جن کی تصانیف کی تعداد پچاس سے اوپر ہے۔ اور دور آخر میں شاہ ولی اللہ، خان آرزو، آزاد بلگرامی، اور سرسید احمد خان، شبلی، نذیر احمد کی تصانیف کا حال تو سب کو معلوم ہی ہے۔ ان بزرگوں کا اتنا وسیع اور پہلو دار کام واقعی حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ اور اس میں باقی اسباب کے علاوہ مدت تعلیم کے کم ہونے کا بھی بڑا حصہ ہے۔

پرانے نظام تعلیم میں تکمیل کی مدت موجودہ زمانے کی تکمیلی مدت سے بہت کم تھی۔ صرف ہندوستان کے پرانے اہل کمال میں سے چند مثالیں لیجئے۔ فیضی نے ۲۴ سال کی عمر میں تکمیل کی، ابوالفضل نے ۱۵ سال میں، شاہ ولی اللہ نے ۱۵ سال میں، ملا بحر العلوم نے ۱۷ سال میں، قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے ۱۸ سال میں، اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے ۱۷ سال میں اور جو لوگ مذکورہ بزرگوں کی فضیلتوں سے باخبر ہیں انہیں معلوم ہے کہ یہ لوگ معمولی درجے کے لوگ نہ تھے۔

مدت تعلیم کے کم ہونے میں اور کوئی جادو نہیں ـــــ اس کا راز صرف یہ ہے کہ آزاد اور گہرے مطالعہ کے لئے یا عملی زندگی کے لئے طالب علم کو وقت زیادہ مل جاتا ہے ـــــ آخر دیر تک کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ماں باپ کا روپیہ ضائع کرانے سے فائدہ بھی کیا ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تو صرف رہنمائی اور نشان دہی ہونی چاہئے۔ اور اگر غور کیا جائے تو تعلیم علم کی منزلوں کی رسمی اور اصولی نشان دہی کا نام ہے۔ ان رسمیات اور اصولیات کے عبور میں زیادہ وقت لگانے سے سچے مطالعہ یا عملی زندگی کے امکانات اور پروگرام کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔ ان پر زیادہ وقت صرف نہیں کرانا چاہئے۔ یوں پورے علوم کے احاطہ اور گہرے مطالعہ و تحقیق کے لئے تو ایک عمر نہیں کئی عمریں درکار ہیں۔ اس کے لئے تو من المہد الی اللحد کا اصول ہی صحیح اصول ہے ـــــ روایت ہے کہ ابوالفضل نے ریاضی اور علوم طبیعی کی تحصیل اپنی عمر کے آخری ایام میں کی تھی۔ اور اس عمر میں قرآن مجید کے حفظ کرنے کی تو صدہا مثالیں مل جاتی ہیں ـــــ بہرحال عام رسمی تکمیل کے لئے مدت جتنی کم ہوگی عملی زندگی کے لئے وقت اتنا ہی زیادہ بچے گا ـــــ اور یہ وہ قیمتی وقت ہوگا جس کے عمدہ، نتائج سے فرد، اجتماع اور قوم وملت سب کو فائدہ پہنچے گا۔

تعلیم کے مصارف

تعلیم کے مصارف کا سوال بھی اسی مسئلے کے ساتھ وابستہ ہے خصوصاً اس غریب ملک کے لئے اسکی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ یہ درست ہے کہ حیات اجتماعی کے اس دور میں خانقاہوں کی سی بوریا نشینی ممکن نہیں ـــــ اب عام شہری بھی اعلیٰ معیار زندگی کے پرفریب طلسم میں اس حد تک گرفتار ہو چکا ہے کہ اس کو مسجد کی چٹائیوں پر بیٹھنے کی دعوت دینا اس کے احساس عزت پر کچھ زیادتی ہی ہوگی۔ مگر قوم وملک کے موجودہ وسائل کو دیکھتے ہوئے بوریا نشینی کی اسپرٹ پیدا کرنے کی دعوت اور ضرورت ہرگز بے جا اور نامناسب بات نہیں ـــــ یہ حقیقت سب پر روشن ہے کہ اس وقت تعلیم پر مصارف بھی ہے اور بے نتیجہ بھی۔ اس وقت تعلیم شاہ خرچی اور اسراف کا دوسرا نام ہے۔ اس وقت ایک عام شہری گرانی تعلیم سے انگشت حیرت بدنداں ہی نہیں سربگریباں بھی ہے مگر جمود

غلامی، نقالی، کند ذہنی اور روحانی گراوٹ نے ہم سب کو ایسا گونگا کر دیا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس گراں نظامِ تعلیم کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس گرانی کے اسباب پر غور نہیں کرتا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کا علاج تجویز نہیں کرتا۔

موجودہ مدرسوں کے نظام کے مقابلے میں تو مسجدوں اور خانقاہوں کا نظامِ تعلیم ہی زیادہ قابلِ عمل اور غایتوں کے لحاظ سے زیادہ پُرمنفعت نظام تھا جو کم خرچ تھا مگر زیادہ نفع کی طرف لے جاتا تھا۔ اب ہزارہا روپے کے خرچ کے بعد بھی نفع معدوم ہے۔ اُس وقت تعلیم آزاد تھی۔ اب تعلیم مقید ہے۔ اس کی وجہ سے اب حکومتوں کو بھی طرح طرح کی پریشانیاں ہیں۔ تعلیم کے سلسلے گراں ہو گئے ہیں اور اتنے وسیع نظام کے اخراجات کی تکمیل حکومتوں کے بس کی بات نہیں رہی۔ لہٰذا جو نظام بھی نافذ ہوتے ہیں ان کے لئے نہ روپیہ ہوتا ہے نہ وسائل۔ پھر سوال یہ ہے کہ جو نظام چل نہیں سکتا اس کو محض اس وجہ سے چلائے جانا کہ امریکہ یا انگلستان میں ایسا ہی ہوتا ہے کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس وقت عام شہری کے لئے تعلیم عذاب ہی عذاب ہے۔ یعنی بورے کا لڈو کہ جو کھائے وہ بھی پچھتائے جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے! ان حالات میں تعلیم کو ارزاں کرنا ہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم میں بورڈ یا نشینی کی یہ اسپرٹ عملی طور پر پیدا کرنے کی آخر کوئی تدبیر بھی تو ہو۔ اس کا جواب ہے تبدیلیٔ ذہن اور آزادیٔ فکر۔ یہی آزادیٔ فکر ہم میں اس شاہین کی سی جرأت پیدا کرے گی جس نے اقبال کی روایت کے مطابق پہاڑوں پر بسیرا کر لیا تھا۔ یہ جرأت سب سے پہلے قوم کو عرفانِ نفس سے بہرہ ور کرے گی۔ پھر آہستہ سے ہمارے کان میں یہ بات ڈال دے گی کہ اپنے ملک کے مسائل اپنے ملک کے وسائل کے مطابق اور ان کی روشنی میں ہی حل ہونے چاہئیں!

ہمارے ملک کے وسائل ہم سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ہم تعلیم کا سارا بوجھ حکومت پر نہ ڈالیں اور ان ذمہ داریوں میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔ تعلیم قومی زندگی کا ایک آزاد ادارہ ہے۔ اس کا بار پبلک کو برداشت کرنا چاہئے۔ البتہ پیشہ ورانہ اور کارخانجات کی تعلیم یعنی ٹکنیکل تعلیم کی ذمہ داری تمام تر حکومت پر ڈالی جانی چاہئے۔ تاکہ ملک کی ٹکنیکل ضرورتوں کی سرانجامی زیادہ منظم انداز میں ہو۔ اس کے علاوہ جنرل ایجوکیشن کے نصابات کم سے کم ہوں۔ یعنی صرف رسمی نشان دہی کی جائے۔ طویل نصابات سے اخراجات بھی بڑھتے ہیں اور سطحیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور ان سب امور کے ساتھ عام تعلیم کی تکمیلی مدت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ رہا حکومت کی ملازمتوں کا سوال، سو اس کے لئے ہر سطح پر مقابلے کے امتحانات رائج کئے جائیں، مگر تعلیم کی واحد غایت ملازمت نہیں ہونی چاہئے۔ تعلیم کا ایک نتیجہ ملازمت تو ہو سکتا ہے مگر تعلیم برائے ملازمت کی عادت عہدِ غلامی کی یادگار ہے۔ پھر تعلیم اور عام پیشوں کے درمیانی فاصلوں کو بھی مٹا دینا چاہئے۔ کیونکہ پیشہ وروں کو یہ احساس ہے کہ ہم دوسرے شہریوں سے کم درجے کے لوگ ہیں۔ اس احساس کے تحت پیشہ وروں کی اولاد بابو بن جانے کو قابلِ فخر چیز خیال کرنے لگتی ہے۔ اسی وجہ سے پیشے نابود ہو رہے ہیں۔ اسی طرح تعلیم میں سادہ زندگی کی تربیت کا اصول بھی رائج ہو۔ کیونکہ اس وقت ملک میں سادہ

زندگی کو ذلت کا نشان سمجھا جاتا ہے ۔ کوٹ، پتلون اور ریشمی کپڑے لازمہ عزت و شرافت بن گئے ہیں۔
مگر یہ تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تعلیمی اداروں میں اخلاقی دفعہ ۱۴۴ نافذ نہ ہوگی جس کی رُو سے منقش پالکیوں کا داخلہ ان سڑکوں پر ممنوع ہو جائے جن پر طالب علموں کی ہر وقت آمدورفت رہتی ہے ۔ یہی وہ سڑکیں ہیں جن پر غریبوں کے بچے سرنگوں سرافگندہ اور مغموم پھرتے ہیں ۔ اور ایک ایسے معاشرہ کی سوچ سوچنے لگتے ہیں جو نازک طبائع کے لئے کچھ ناگوار سا ہے یعنی محض پیدل چلنے والوں کا معاشرہ ۔ بلاشبہ سوچ کا یہ انداز ذہنی کج روی کا نشان ہے ۔ مگر اس ذہنی کج روی کی ذمہ داری کس پر ہے؟ یقیناً اس نظام تعلیم پر جس میں خدا کا نور ـــــ یا علم ـــــ منڈی کے مال کی طرح چور بازار میں فروخت ہوتا ہے ۔ اور اس سے صرف وہی آدمی استفادہ کر سکتا ہے جس کے جیب میں خزانہ شاہی کے زرنگار نوٹ موجود ہوتے ہیں۔ پُرانے نظام تعلیم نے اسی لئے تو علم کو خود ایک دولت قرار دیا تھا ۔ اور امام غزالی نے تو علم فروشوں کو لائق تعزیر قرار دے کر فیصلہ ہی کر دیا تھا کہ تعلیم ہر حال میں مفت ہونی چاہئے ۔ پاکستان کے مجوزہ نظامِ تعلیم میں حجۃ الاسلام امام غزالی کا یہ زریں اصول خاص طور سے مدِّنظر رہنا چاہئے ۔

اگر پاکستانی تعلیم کا منصوبہ ان تعلیمی اصولوں پر بنایا جائے تو اس سے بہت سی وہ شکایتیں رفع ہو سکتی ہیں جو اس وقت لوگوں کی زبانوں پر ہیں ۔ انہی تعلیمی اصولوں سے مشرقی علوم کے بہت سے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں ۔ اگر آج ملک میں نظریۂ وحدت تعلیم نافذ ہو جائے اور نئے اور پُرانے کی یہ غیر قدرتی تقسیم مٹ جائے تو مسجد و خانقاہ اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے درمیانی فاصلے بھی مٹ جائیں گے ۔

مسلم ثقافت

ہندوستان میں

"اس کتاب کی تالیف کا مقصد یہ بتانا ہے ۔ کہ مسلمانوں نے برصغیر پاک و ہند کو گزشتہ ایک ہزار سال کی مدت میں کن برکات سے آشنا کیا اور اس قدیم ملک کی تہذیب و ثقافت پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا ۔ قیمت ۔/۱۲ روپے ۔

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ۔ ۲ کلب روڈ ۔ لاہور